روحانیت سے سیاست اور شعر وادب تک

انٹرویو: سید نسیم تقی جعفری

عکاسی: سمیر اشفیق/محمد آصف ملک

سوال: سر کیا پیری فقیری اور روحانی شخصیت بننے یا ہونے کے لئے دنیا کے مسائل اور غیر معمولی ٹھاٹ، پروٹوکول، معاشی آسانیاں، سامان عیش اور امراء سے تعلقات ہونا ضروری ہیں؟

جواب: پروفیسر احمد رفیق اختر: میری نگاہ میں تو بالکل نہیں ضروری۔ بلکہ جو لوگ میرے پاس آتے ہیں، میرا خیال ہے بہت سارے گواہ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ہمارے یہاں کسی قسم کا کوئی خصوصی پروٹوکول نہیں پایا جاتا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ لٹریری اور علمی وقار کی شخصیات کا میں زیادہ احترام کرتا ہوں۔ تعلیمی شخصیتیں ہوں۔ وقار کی شخصیتیں ہوں، ان کا مگر سرکاری وقار نہیں۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ میرے پاس عہدے والے لوگ ایک ہی طرح سے آتے ہیں۔ ان کا کوئی اس قسم کا تصور نہیں ہے نہ ان کو کوئی خصوصی پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ مگر آپ دیکھیں گے کہ بعض جو بڑے لوگ ہیں۔ بڑے لوگ کیا، ان کو بڑا کہنا میں لفظ بڑا تو نہیں استعمال کروں گا۔ ان کے اپنے کچھ مسائل ہوتے ہیں۔ جیسے وہ عوام سے شرمیلا پن محسوس کرتے ہیں۔ جیسے وہ اپنی بات ایک مجمع میں نہیں کرنا چاہتے ہیں، تو ان کو علیحدہ ٹائم دینے کا مطلب یہ نہیں کہ ان کی عزت کی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض اوقات مجھے غریب آدمی ایک کمرے میں لے جاتے ہیں کہ میرا بڑا مسئلہ ہے۔ مجھے آپ یہ بتا دیں، تو مجھے اس وقت جانا پڑتا ہے۔ جو لوگ میرے ساتھ اکھٹا اور تنہا چاہتے ہیں، چاہے معاملہ وہی نکلے، جو ساری دنیا کا ہے تو ان کو پھر ہم لوگ پرائیویسی دیتے ہیں۔ زیادہ تر وہ لوگ اشرافیہ میں پائے جاتے ہیں۔ اشرافیہ کو پرائیویسی دینے کا قطعاً مطلب دوسرا نہیں ہوتا ہے۔ ایک بات خواجہ مہر علی نے اپنی کتاب میں ذکر فرمائی ہے کہ شاید اشرافیہ کا کسی شیخ کی طرف متوجہ ہونا اس کے اس سٹیٹس کی نشاندہی کرتا ہے جس پر خدا نے اسے متمکن کیا ہوتا ہے

سوال: کیا دولت روحانی بزرگی اور فقر کے راستے کی رکاوٹ ہے یا دولت کی فراوانی سے فقر کی دنیا اور نکھر جاتی ہے اور اس کے حسن اور جاذبیت میں اضافہ ہو جاتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: میرا خیال ہے کہ اس دفعہ جہاد پر جو میں نے لیکچر دیا تھا، اس میں میں نے واضح کیا کہ جو لوگ علمی، ادبی اور عبادتی راستے سے گزرتے ہیں، ان کی مشقتیں، ان کے مسائل بے شمار ہوتے ہیں اور قرآن حکیم میں جب وہ اولیاء کے درجے تک پہنچتے ہیں، تو خدا کہتا ہے کہ میرے دوستوں پر ہم کسی قسم کا خوف و حزن نہیں چھوڑتے ہیں۔ یہ رستہ طویل ہے مشکل اور جنون عقل کا ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے ہی کم لوگ اس رستے کو کوالیفائی کرتے ہیں۔ علمی گریڈ مختلف ہو جاتے ہیں۔ فضیلتوں کے گریڈ مختلف ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھیے گا، جو ابھی میں نے آپ سے کہا ہے۔ اس کے برعکس ایک صاحب مالدار شخص ہے۔ جس کے پاس بہت مال ہے اور وہ خدا کے رستے پر خرچ کر دیتا ہے تو اس کے بارے میں اللہ فرماتے ہیں (قرآنی آیت)۔۔۔ وہ لوگ جو اللہ کے رستے میں مال خرچتے ہیں۔ رات میں یا دن میں، چھپا کے یا بتا کے، اس کا اظہار کر کے (قرآنی آیت)۔۔۔ ان کو اللہ کی طرف سے ایک اجر دیا جائے گا۔ (قرآنی آیت)۔۔۔ تو آپ دیکھیے کہ اولیاء اللہ کا اور صاحب ثروت لوگوں کا خدا کے رستے میں خرچنے کا اجر برابر ہے ایک ولی جو فقر و فاقہ سے جدوجہد کر رہا ہے تو وہ سٹیٹس جس کو پہنچتا ہے وہ ہے کہ اسے خوف اور حزن سے نجات مل جاتی ہے۔ دوسری طرف ایک بندہ یہ بالکل نہیں کر رہا ہے۔ وہ صرف مال کما رہا ہے اور مال خرچ کر رہا ہے لوگوں پر اور بتا کر شہرت کے لیے کر رہا ہے شوشا کر رہا ہے اس کو بھی اللہ وہی صلہ دے رہا ہے (قرآنی آیت)۔۔۔

سوال: کیا فرش نشین اور گودڑی نشین کے لئے اپنی نفس کی خواہشات کے خلاف عمومی بندوں سے بے نیاز ہونا ہی حقیقی بزرگی ہے اور نہایت لاتعلقی کی حالت میں زندگی گزارنا ہی روحانیت اور فقر کی دنیا کی کامیابی کی دلیل ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: دیکھیے! حضور پاک ﷺ نے ایک شخص کو نیا جوتا پہنے دیکھا، تو اسے دعا دی۔ پہنو اور پرانا کرو۔ کسی کو اچھا لباس پہنے دیکھا، تو اس کو دعا دی فرمایا، اگر تمہارے پاس مال ہے، تو اس کا اظہار تمہارے جسم و جان پر ہونا چاہیے۔ یہ فقر و فاقہ کی یہ روایات جو ہمارے پاس آئی ہیں، میرا اپنا خیال ہے کہ خود ساختہ ہیں۔ دیکھیں اصحاب صفہ بھی تھے۔ اصحاب صفہ کے پاس تو اسباب نہیں تھے کہ وہ اچھے کپڑے پہنتے۔ اچھے جوتے پہنتے۔ تو ان کا احترام بہت ہے کہ فقر و تنگی کے رستے سے خدا تک پہنچے۔ دوسری طرف عثمان غنی تھے۔ ایک طرف ابوذر غفاری تھے، ادھر وہ تھے۔ تو اسلام میں دونوں رستوں کی کشادگی بتائی گئی ہے تاہم دونوں رستوں میں ایک ہی چیز اہم سمجھی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔ اس لحاظ سے اسلام اتنا متوازن مذہب ہے

باقی میں سمجھتا ہوں کہ جس لحاظ سے لوگوں نے جدوجہد کے یہ مختلف طریقے نکالے ہیں، یہ ان کے اپنے مسائل ہیں، اللہ کے نہیں ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے نہیں ہیں قرآن حکیم میں اللہ میاں کہتا ہے کہ یہ جو رہبانیت کے طریقے تھے۔ بھوکے مرنا اور چلے کھینچنا، ان میں کچھ لوگ نبھا گئے ہیں۔ کچھ نہیں نبھا سکے۔ ہم نے انھیں ایسا کرنے کو نہیں کہا تھا اور اچھا کھانا اور پھر یہ تعریف کرنا؟ ایک دفعہ جب اچھی چیز سامنے آئی، تو اصحاب چپ رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے تو جنات بہتر ہیں کہ جنھوں نے کہا تھا۔۔۔۔۔ تو کیا آپ کا خیال یہ ہے کہ اچھے کھانے میں حسن نہیں ہوتا؟ ہم نے حسن کو محدود بڑا کر دیا ہے کسی دست مشاق کی بنی ہوئی کوئی اچھی ڈش میں حسن نہیں ہے؟ بات یہ ہے کہ سرجن اور قصائی میں کیا فرق ہے؟ کلچر کا فرق ہے۔ کلچر اور علم کا فرق ہے۔ اسی طرح ایک اچھی چیز کے لیے آپ بازار میں ایک کیک ڈھونڈنے جاتے ہیں۔ وہ 35 روپے کا

ل جائے گا۔ یہ اس کی اصل قیمت ہے۔ مگر اسی کی پیشکش ایک اچھی بیکری سے آپ دیکھتے ہوں، تو وہ 100 یا 125 کا ہے۔ اچھی پیش کش کو آپ کتنی خوشی سے 60,70 روپے اضافی دیتے ہیں۔ سو کسی بھی چیز میں اگر بہتری ہو، صلاحیت ہو، خوش اسلوبیت ہو، حسن ہو، اس کو سراہنا لازم ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ اچھے کھانے میں سے دو لقمے چھوڑ دیں، تو آپ صوفی ہو گئے۔

سوال: جب سلطانی، درویشی اور فقیری جیسے ادارے اور میدان بھی عیار و مکار لوگوں سے بھر جائیں، تو پھر ایک عام آدمی کا کیا بنے گا؟ وہ کیوں کر زندگی گزار سکے گا اور اس کی فطری رہنمائی کون کریگا؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: بات تو آپ نے درست کہی۔ مگر بات دونوں طرف ایک ہی ہے۔ میں نے کشف المحجوب کے ابتدائی صفحے پڑھے، تو آپ نے بڑی ایک خوبصورت بات کی۔ کہا کہ ابو سعید ابو الخیر ہم تو جب تعلیم اور درستگی اعمال کے لیے گزرتے، تو ہم نے بے شمار مرشدوں سے ملاقات کی اور ہم نے سبق سیکھے۔ ہم نے خراسان کی پہاڑیوں میں تین سو چنیدہ اولیاء اللہ دیکھے۔ مگر ایک وقت آئے گا کہ طلب تو ہوگی، تجھے رہبر کوئی نہیں ملیگا۔ تو ڈھونڈنے چلے گا، تجھے کچھ نظر نہیں آئے گا۔ اتنی بات یاد رکھنا کہ جس اللہ نے پہلے کو عطا و بخشش کی ہے تمہیں بھی کرے گا اور اس کو کوئی واسطے نہیں چاہئیں۔

سوال: اب میں ذرا سا پیٹرن چینج کرتا ہوں اور ایک سیاسی سا سوال ہے کہ ہمیں قائد اعظم کے بعد آج تک مخلص و باشعور قیادت نصیب نہیں ہوئی۔ ہم بچپن سال سے اپنے ملک میں مثبت تبدیلی اور انقلاب کا خواب دیکھ رہے ہیں اور مسلسل دھوکے کھا رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب جس باغ کا مالک خود اپنے باغ کو تباہ و برباد کرنے کے درپے ہو تو پھر اس باغ کا انجام کیا ہو سکتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب ایک بنیادی فرق آپ کو بتاؤں کہ قائد اعظم پڑھا لکھا بندہ تھا۔ اس کے پاس پڑھے لکھے لوگ نہیں آئے۔ جو بھی اس کا پروفیشن تھا۔ جس مقصد کا بیڑا اس نے اٹھایا اور جو طریقہ اس نے اختیار کیا، اس کو اپنے مخالفین کے آلات کا پتا تھا اور اپنے آلات کا پتا تھا۔ ان کی اپروچ کا پتا تھا اور اپنی اپروچ کا پتا تھا۔ اس پر مستزاد ان کو اپنے اور ان کے مقاصد کا پتا تھا۔ اس کو میں سیاسی راہنما نہیں کہہ سکتا۔ وہ مدبر تھا، دانا تھا اور اس کے اس اخلاص کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے جو اسے کریڈٹ بخشا، وہ آپ کے سامنے ہے۔ پاکستان میں بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کی تقسیم غلط تھی۔ میرا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک دن پاکستان بنتا اور دوسرے دن ٹوٹ جاتا، تو بھی پاکستان کی تخلیق صحیح تھی۔ میرا یقین ہے کہ پاکستان کو غریب آدمی نے بگاڑا ہے نہ اجاڑا ہے۔ پاکستان کو نیم پڑھے لوگوں نے جو اپنی اپنی کتریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ہر چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان میں سے کوئی دانشور نہیں تھا۔ کوئی عالم نہیں تھا۔ بیشک انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہیں تھی کہ خلق خدا کی خدمت کرتے۔ ملک کو بناتے۔ یہ ایک وجاہت کے پیٹرن میں آئے اور چلے گئے۔ اب بھی بہت کچھ ہو رہا ہے مگر ملک سخت جان ہے اور لوگ امید منقطع نہیں کر رہے ہیں۔ یقین ہے انشاءاللہ کہ ان کو صلہ کبھی نہ کبھی ضرور ملے گا۔

"پاکستان کو غریب آدمی نے بگاڑا ہے نہ اجاڑا ہے۔ پاکستان کو نیم پڑھے لوگوں نے جو اپنی اپنی کتریوں میں الجھے ہوئے تھے۔ جنھوں نے ہر چیز کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ ان میں سے کوئی دانشور نہیں تھا۔ کوئی عالم نہیں تھا۔ بیشک انہوں نے بہت سی کتابیں لکھی ہوئی ہیں۔ مگر ان کے دل میں کوئی ایسی آرزو نہیں تھی کہ خلق خدا کی خدمت کرتے۔"

سوال: پھر ایک ذاتی سا سوال اور یہ لوگ اکثر اوقات ڈسکس بھی کرتے ہیں کہ آپ اکثر اوقات اپنے لیکچرز اور گفتگو کے دوران زیادہ تر دانشوروں، شاعروں، ادیبوں، صوفیوں اور علماء پر کڑی تنقید کرتے ہیں اور ہم نے آپ کو کسی شخصیت کی تعریف کرتے یا سراہتے ہوئے کم کم ہی دیکھا ہے۔ کیا آپ سب کی نفی کر کے اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کی کوشش تو نہیں کرتے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ماشاءاللہ اچھا سوال ہے۔ مگر میری بھی زندگی کا ایک اصول ہے کہ میں کوئی شخصیاتی تنقید کبھی بھی نہیں کرتا۔ مگر میں نے بڑی مشقت سے کچھ سبق سیکھے ہیں۔ علم میں کسی کو رعایت دینے کا مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا۔ کیونکہ علمی رعایتوں کی وجہ سے ہی ہم انتہائی مذہب کے کنفیوز کانسیپٹ تک پہنچ چکے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر مجھے یہ کہیں کہ فلاں شخص صاحب النجم ہے فلاں علامہ دہر ہے تو مجھے ان پر بڑی شدت سے اعتراض ہوتا ہے۔ میں ادھر دیکھتا ہوں کرواٹس جیسا بندہ جس نے ڈبل ہیلکس دریافت کیا ہے اور دوسرے جو آفاقی انکشافات کے حامل لوگ ہیں۔ اگر ان کے نام کے ساتھ آپ کبھی القابات نہیں دیکھتے ہیں۔ انہیں بس ایک اور دانشمند شخص سمجھا جاتا ہے۔ ان کو میں سوچتا ہوں، آخر کیا مرض پڑا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں نے اپنی ذات کے لیے بھی ایک پوری کتاب دیکھی ہے۔ بڑے بزرگ لوگ مستند سمجھے جاتے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کے نزدیک، جن میں ان کا ایک رسالہ دیکھتا ہوں، تو نیچے عجیب قسم کے لفظ لکھے ملتے ہیں اور ساتھ ہی ان کا سلسلہ ولایت لکھا جاتا ہے۔ چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ، اویسیہ، آخر اس کی کیا ضرورت ہے؟ سوائے اس کے کہ وہ آپ کو قائل کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ میں بہت بڑا ولی ہوں اور وہ ان سارے سلسلوں کی میراث لیے بیٹھا ہے۔ اب ہمارے پاس رستہ ہی کوئی نہیں۔ کسی طریقے سے بھی تم بچ کے نہیں جا سکتے۔ اگر تم اویسیہ ہو، تو میں اویسیہ ہوں۔ چشتیہ مانو، تو چشتیہ ہوں۔ قادریہ مانو، تو قادریہ ہوں۔ اس قسم کی غیر معقول حجتیں مجھے پسند نہیں آتیں۔ ان میں میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ نہ کسی کے ساتھ۔

باقی میرا خیال یہ ہے کہ ذاتی ملاقاتوں میں کوئی شخص مجھے یہ الزام نہیں دے سکتا کہ میں نے آج تک انفرادی ملاقاتوں میں کبھی بھی کسی کی ذاتی طور پر توہین کی ہو۔ مگر جہاں آپ لوگوں کو ہدایات پاس کرتی ہیں، تو انہی عقیدتوں کے سہارے ہم نے توڑی ہیں تا کہ لوگ علم کو تلاش کریں۔ اسی اندھے پن میں بصارت کی آگ کو کوشش کرنا پڑتی ہے۔ کچھ لوگ اس وجہ سے ناراض ہوتے ہیں۔ میں نے بہت سارے لوگوں کی تعریف بھی کی ہے اور سب سے زیادہ تعریف میں نے اللہ کے رسول ﷺ اور اصحاب رسول کی کی ہے۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ آج تک بڑے سے بڑا شیخ کسی صحابی سے کیسے بڑھ سکتا ہے۔ جو اپنی ترجیح کے مکمل احساس میں ہے اور یہ صاحب اپنی ذاتی ترجیح استعمال کر رہے ہیں۔ بڑے بڑے دانشور اور علماء دنیا میں گزرے ہیں۔ بڑے بڑے عالمان حقائق گزرے ہیں۔ لوگ ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ صدیاں ان کے نام سے منسوب ہیں مگر جب میں یہ جان لوں کہ اس کی بنیادی ترجیح ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی، تو میں اسے عالم کیسے سمجھ لوں؟ کیسے ہم جانیں گے؟ ہو سکتا ہے اس بات کو غلط کرنے کے لیے آپ کو میری ساری اپروچ ہی غلط کرنی پڑے گی۔ اگر میری ساری اپروچ غلط ہے پھر وہ صحیح ہیں۔ اور اگر میری اپروچ صحیح ہے تو اس کا تو وقت، زمانہ اور مقامی فیصلہ کرے گا۔ اگر میری اپروچ صحیح ہے تو پھر جو میرے اعتراضات ہیں ان کی طرف سے ان پر علمی جواب آنا چاہیے۔ اس میں ذاتی توہین تو مراد ہی نہیں ہے اس میں بعض اوقات لفظ میرے ذہن میں چبھ جاتے ہیں۔ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کسی نے کسی کے لے مبالغہ آمیز لفظ لکھا ہے، تو مجھے یہ لفظ بہت چبھتا ہے؟ میں سوچتا ہوں، یہ کیوں ایسے لفظ استعمال کرتے ہیں؟ بہت ساری شخصیات کے ساتھ جو لفظ استعمال ہو رہے ہیں، غلط ہیں۔ ویسے تو میری گلی کا مولوی بھی زبدۃ العلماء لکھتا ہے۔ اپنے ساتھ رئیس المتکلمین لکھتا ہے۔ کیا اس کو درست کہا جا سکتا ہے؟ وہ ایک عام آدمی کی طرح کیوں نہیں رہتے؟

"جب تک کوئی تصور آپ کا آفاقی نہ بن جائے۔ جب تک کوئی خیال آپ کا یعنی ایک یقینی اپروچ نہ بن جائے، اس وقت تک آپ کی شاعری بڑے نچلے گریڈ میں رہے گی۔ مگر اس نچلے گریڈ کی شاعری میں بھی وہ شعر ابدی ہو جائے گا، جو عمومی کیفیات پر لکھا ہوا ہے۔"

تو کوشش تو یہی کرنی چاہیے کہ ہم دوسرے لوگوں کی طرح ہوں۔ اللہ کا شکر ہے میرے احباب میرا مزاج بھی سمجھتے ہیں اور کسی قسم کی جائز تعریف سے بھی گریز کرتے ہیں۔ میرے تو شاگرد ایسے ہیں کہ منہ پھاڑ کر مجھ پر اعتراض کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ سادہ سے سادہ میرا دوست جو ہے اگر اسے مجھ میں کوئی بات اچھی نہیں لگتی، تو وہ اس پر ایک نہیں سرا سر اعتراض جاری کر دے گا کہ مجھے آپ کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ آپ یہ کیوں کرتے ہیں؟ یہ ہم میں بے تکلفی موجود ہے اس قسم کا کوئی پرابلم ہمارے لوگوں کو نہیں ہے۔

سوال: سر آپ بنیادی طور پر لٹریچر کے آدمی ہیں۔ ایک طویل مدت تک آپ نے لٹریچر پڑھایا ہے، ہو سکتا لٹریچر کے بارے میں آپ کی اپروچ بھی بڑی منفرد ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ شاعری کس حد تک اثرانداز ہو سکتی ہے کسی ملک، قوم اور فرد پر محبت، نفرت کے اثرات مرتب کر سکتی ہے؟ اور اگر واقعی ایسا نہیں، تو پھر شاعری کیوں کر معاشروں اور قانونوں کی تباہی کا سبب بنتی ہے؟ کیا افلاطون کا اپنی republic (ری پبلک) سے شاعروں کو نکال دینے کا فیصلہ درست تھا؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب حیران کن بات آپ کو بتاؤں کہ انگریزی میں جان ملٹن ایک بڑا شاعر ہے اور بڑی عجیب بات جو پہلے کسی کے ذہن میں نہ آئی ہو کہ جان ملٹن نے جو اپنا شاہکار لکھا، Paradise Lost (جنت گمشدہ) اس کا موضوع مذہب تھا۔ گو کہ وہ بہت بڑا فلاسفر، دانشور اور شاعر تھا، مگر جو اس کی اعلیٰ درجے کی کتاب ہے وہ مذہب کے موضوع پر ہے۔ دانتے اپنے وقت کا بہت بڑا شاعر ہے مگر اس کی شہرت اس کی مذہبی موضوعات کی کتاب کی وجہ سے ہے۔ ہمارے ہاں اقبال بہت بڑا شاعر ہے اتنا بڑا شاعر کہ بہت سارے شاعر اس کے سائے تلے پس گئے ہیں مگر اس کا موضوع بھی مذہب ہے۔ تو ہوتا یہ ہے کہ شاعری اپنے موضوعات کے لحاظ سے ترفع پاتی ہے گریڈ بناتی ہے۔ جہاں حضرت داغ نے اپنے دیوان کی اوصاف کی بات کی، مجھے بھی وہ شعر بڑا پسند ہے کہ

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

مگر یہ موضوعات وقتی آپ کو تسکین دیتے ہیں۔ یہ آپ کے اندر کوئی مستقل اثر نہیں چھوڑتے۔ تو شاعری بھی جب کسی بڑے مقصد سے نا آگاہ ہو گی، تو وہ مقامی ہو گی، کم عرصہ زندہ رہے گی۔ دور کیوں جاتے ہیں۔ آپ فیض کو دیکھئے۔ کچھ دن ہی ہوئے ہیں اس کو تو بھی کوئی انعام مل رہا ہے۔ جس کو روسی انعام دے رہے ہیں۔ دنیا اس کو بڑا شاعر سمجھ رہی ہے اس کی اس شاعری کی وجہ سے، جو اس نے جدید موضوع پر کی۔ جو اس نے سرمایہ داری کے خلاف لکھی یا وہ نظمیں، جو اس نے اپنے خیال میں اس نے سوشلسٹ کانسپٹ پر لکھیں۔ اب وہ نظمیں پڑھنے والے کوئی نہیں رہ گئے۔ وہ ایک لوکل موضوع ہے، جو گزر جاتا ہے۔ شاعری اسی وقت بلندتر ہوتی ہے، جب وہ اپنے موضوع کو بلند کرتی ہے۔ غالب کو دیکھئے کہ آج بھی وہ مابعد الطبیعات کا شاعر ہے۔ وہ ذات سے نکل کر بات کرتا ہے اپنے خیالات کو ابدیت میں لے جاتا ہے۔ یعنی اصول تمام بڑے کلام، بڑی شاعری، بڑے ادب اک یہ ہے جو پرسنل نہ ہو۔ بلکہ پرسنل کیفیت سے گزرتا ہوا عالم گیر ہو جائے۔ اب اگر اس قسم کی شاعری موجود نہیں ہے جسے ہم دیکھتے ہیں۔ میں نے پاکستان کی شاعری کا بہت برا حال دیکھا ہے۔ لاہور کو میں نے اسی میں چھوڑا۔ اسی، ستر اور اسی کے درمیان ہمارے پاس وجودیت کا تصور آیا۔ تو میں دیکھ رہا تھا کہ تمام شاعری وجودیت ہو گئی۔

یہ جو جلدی جلدی نکلنے اور ڈھلنے کا عمل ہے یہ کہیں بھی پائیداری کا سمبل نہیں بنتا۔ جب تک کوئی تصور آپ کا آفاقی نہ بن جائے۔ جب تک کوئی خیال آپ کا یعنی ایک یقینی اپروچ نہ بن جائے۔ اس وقت تک آپ کی شاعری بڑے نچلے گریڈ میں رہے گی۔ مگر اس نچلے گریڈ کی شاعری میں بھی وہ شعر ابدی ہو جائے گا، جو عمومی کیفیات پر لکھا ہوا ہے۔ جو عمومی ہے۔ جو لوگوں کے کسی بڑے حساس اور سادہ جذبے کو راہ دے رہا ہے۔ وہ پھر بھی باقی رہ جاتا ہے اور ایسے شاعر تو کہیں نا کہیں موجود ہیں۔ مگر بڑا شاعر ابھی پیدا نہیں ہوا۔ اقبال کی بڑی زیادتی ہے۔

اقبال نے بڑا ہجر کیا۔ اس کی ایک بڑی شاعری نے لمبی طویل لائن چھوڑ دی چھوٹے شاعروں کی۔ باقی رہی افلاطون کی وہ بات، تو افلاطون تھوڑا سا اس میں اس کے گریڈ میں ہکبر استعمال کر گیا۔ چونکہ فلاسفرز کو جاننا۔۔۔۔۔ اور بہت بڑا۔۔۔۔۔ ہے اور شاعر چونکہ معاشرے سے بھی گریز کر رہا ہے۔ فلسفہ حیات سے بھی گریز کر رہا ہے۔ اس وقت بھی شاعر آج ہی کے دور کی طرح ہوتے ہوں گے۔ موضوع کو اٹھا آسمان تک لا رہے ہیں اور قافیہ، ردیف ڈھونڈ رہے ہیں، تو غالباً ان کی عملی نا اہلی کی وجہ سے افلاطون نے یہ کہا ہوگا۔

سوال: سر آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ مادی پرستیت کا دور ہے اور ہم چیزوں کا معیار اپنے نفع ونقصان سے دیکھتے ہیں کہ جس چیز کا ہمیں مالی فائدہ ہے وہ ہمارے لئے اہم ہے اور جس سے کوئی مالی منفعت ہم حاصل نہیں کر سکتے، اس کی اہمیت بہت کم ہے تو آپ اس مادہ پرستی کے دور میں شعر و ادب کی کیا اہمیت اور افادیت قرار دیتے ہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شاہ صاحب معاشرہ ہمیشہ کسی نہ کسی عبوری دور سے گزرتا ہے۔ بعض اوقات کسی بڑے عبوری دور سے گزرتا ہے اور اس دور سے گزرتے ہوئے مذہبی اور ذہنی انارکی، قدروں کی انارکی پیدا ہوتی ہے۔ انارکی اور اس عبوری دور کا کنٹرول اگر کسی بڑے دانشور، سوچنے سمجھنے والے طبقے کے ہاتھ میں ہے تو عبوری دور، یہ دور زیاں بغیر کسی تصادم اور خطرے کے گزرتا ہے مگر جب یہ دور کم عقلوں کے ہاتھ میں ہوگا، تو اس کے نتائج بڑے خوفناک ہوں گے۔ آپ جیسے ابھی ماڈرن زمانے میں معاشرے کے اثر و نفوذ کو دیکھیں کہ جیسے صدر صاحب نے فرمایا کہ جس کو آنکھیں بند کرنا ہیں، وہ بند کر لے اور نیکریں پہن لو اور دوڑ میں لگ جاؤ۔ تو یہ عبوری دور کی مٹی پلید کی جا رہی ہے۔ یہ اس میں سے سرخرو ہونے کا طریقہ نہیں ہے۔ کم عقل لوگ چاہتے ہیں کہ اس سے عبوری دور گزر رے۔ یہ بنیادی طور پر بڑے رنجیدہ انداز میں تبدیلی چاہتے ہیں۔ یہ بڑا ہی غلط بندوبست ہے اس سے کوئی معاشرہ تبدیل نہیں ہوتا۔ بلکہ الٹا اس سے ذہنی انارکی کے کچھ پہلو پیدا ہوتے ہیں۔ شاعر اور ادیب ایک حساس مخلوق ہے جو اس تبدیلی کو محسوس کرتی ہے۔ اب اگر شاعر اور ادیب اس تبدیلی کو پروان نہیں چڑھا رہا۔ یہ بڑی اہم بات آپ کو بتا رہا ہوں کہ اگر ہمارا شاعر اور ادیب اپنے ذہن کی انارکی اور بحران کو درست نہیں کرتا اور وہ تبدیلی کو تحمل اور شعور سے پیش نہیں کرتا، تو وہ بیکار ہے مگر بہت سارے شاعر اور ادیب جب اس انارکی کا حصہ ہو جاتے ہیں اور اس تبدیلی کے لپیٹے میں پس جاتے ہیں یا اس سے آگے گزر کر اس کا حل پیش کرتے ہیں، وہ اسی تنازعے میں آ کر خود بھی ایک مجبور محض ہو کر رہ جاتے ہیں، تو وہ شعر و ادب کسی کام کا نہیں ہوتا۔ پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا کوئی ادیب میری نظر میں نہیں ہے جو اس وقت کی مذہبی اور ذہنی انارکی سے نمٹنے اور اس کے بعد کوئی بہتر قسم کا شعور بخشے۔ اس لئے شاعر و ادیب اس وقت مجھے تو بیکار ہی لگتے ہیں۔

"ہمارے سیاستدانوں کا وژن بڑا محدود ہے۔ وہ جس مقامی پوزیشن سے نکلتے ہیں، اس سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ مثلاً اگر آپ آج بھی کوشش کریں کہ ایک لوکل سیاستدان کو آپ ایک بین الاقوامی سطح پر لے جائیں، تو وہاں اس کے پاس تعلیم ہے نہ اس کے پاس انداز ہے نہ اس کے پاس اقتدار کے کچھ بنیادی اصول ہیں۔"

سوال: آج کل ہماری سیاست میں فوج کا عمل دخل ہے اور اس کا کردار بڑھتا جا رہا ہے کیا اس سے ہمیں بحیثیت قوم نقصان ہو رہا ہے یا فائدہ؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: شروع سے آپ اگر تاریخ عالم دیکھتے ہیں، تو ملکوں کی حیثیتوں میں یہی جو جنرل ہے اس کا بادشاہ بنتا ہے۔ تو فوج کی کوئی بغاوت اسی طرح ہوتی ہے اور جب وہ بادشاہ بنتا ہے تو اس سے فوج سولائزیشن میں داخل ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہماری فوج کبھی سولائزیشن میں داخل نہیں ہوئی ہے۔ فوج فوج ہی رہتی ہے اس کا مہذب دنیا کے ساتھ تعامل کبھی مضبوط نہیں ہوتا ہے۔ اصولاً و علماً و عقلاً کوئی بھی بادشاہ ڈکٹیٹر ہو یا سب سے بڑا ڈکٹیٹر ہو، اس کو سول کے انداز اور طریقے سیکھنے ہوتے ہیں۔ کیونکہ لوگ بہرحال وردی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ تمام عموی

"پاکستان میں بدقسمتی سے ایسا کوئی ادیب میری نظر میں نہیں ہے، جو اس وقت کی مذہبی اور ذہنی انارکی سے نمٹنا اور اس کے بعد کوئی بہتر قسم کا شعور بخشے۔ اس لئے شاعر و ادیب اس وقت مجھے تو بیکار ہی لگتے ہیں۔"

لوگ جو ہیں، وہ آج کی وردی ہو یا کل کی، ایک لمبے عرصے تلوار کو لٹکتا ہوا نہیں دیکھ سکتے۔ تو لازم بات ہے کہ فوجی جو بھی قابو پاتے ہیں، اس کو جلد سے جلد اپنی خلافت یا اپنی بادشاہت کے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ اس کلچر کو سولائز ڈھونا پڑتا ہے۔ اب پاکستان میں جتنے فوجی غلبے آئے ہیں، وہ سولائزیشن کی حدود میں داخل نہیں ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے لوگ ان سے مزید خوفزدہ ہو رہے ہیں اور وہ کوئی اچھا تاثر نہیں دے رہے۔ اس کا ایک نتیجہ ایک اور انقلاب ہے یا اس کا نتیجہ اقتدار کی جزوی منتقلی ہے۔ اور چونکہ لگتا ہے کہ اب تو آدمی واقعی صدر بننا چاہتا ہے اور انھوں نے اگر ایسا کرنا ہی ہے، تو پھر انھیں تہذیب کا حصہ بننا ہوگا۔

سوال: کیا ہمارے سیاستدان کرپٹ ہیں یا کا م یا ہمارے ملک کے سیاستدانوں کو قوم و ملک کی خدمت کرنے کا موقع ہی فراہم نہیں کیا گیا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: ہمارے سیاستدانوں کا وژن بڑا محدود ہے۔ وہ جس مقامی پوزیشن سے نکلتے ہیں، اس سے کبھی باہر نہیں جاتے۔ مثلاً اگر آپ آج بھی کوشش کریں کہ ایک لوکل سیاستدان کو آپ ایک بین الاقوامی سطح پر لے جائیں، تو وہاں اس کے پاس تعلیم ہے نہ اس کے پاس انداز ہے نہ اس کے پاس اقتدار کے کچھ بنیادی اصول ہیں۔ میں اس وقت جو جتنے سیاستدان ہیں، ایک طرف دیکھتا ہوں، تو دنیا کے ذہین ترین، اعلیٰ ترین لوگ ہیں، ان کی سلطنت کے تناظر میں چودھری شجاعت کا وہاں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس طرح جب میں دیکھتا ہوں، تو مجھے جنرل پرویز مشرف بڑے عجیب سے لگتے ہیں۔

دنیاوی سیاست کے پہلو پر ہمارے جو سیاستدان ہیں، ایک تو پڑھے لکھے نہیں ہوتے۔ بنیادی طور پر یہ سکولوں سے بھاگے ہوئے لوگ ہیں، جنھوں نے کبھی کوئی چیز مکمل نہیں کی۔ دوسرے یہ زمینداری نظام کی پیداوار ہیں۔ منصب داری سسٹم کی پیداوار ہیں، جو ملک کو بھی منصب داری سسٹم کے تحت چلا رہے ہیں۔ کیونکہ ان کو کسی اور سسٹم کا شعور نہیں ہے۔ یہ ملک کو بھی منصب

داری نظام کے تحت چلانا چاہتے ہیں۔ منصب داری نظام میں بڑے صاحب کو اجازت دینی ہوتی ہے اور سفارش اور رشوت کا تعلق عام ہوتا ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے اگر بیورو کریٹس کی اکیڈمی ہو سکتی ہے تو سیاستدانوں کو بھی کم از کم سیاست کے کچھ اصول سکھانے کے لئے ایک اکیڈمی ہونی چاہیے۔

سوال: سر ہم اپنی سیاست کو کس طرح متقدس، مقدم اور عوام دوست بنا سکتے ہیں؟ اور کیا اس میدان میں پڑھے لکھے لوگوں کی آمد کی ضرورت ہے یا نہیں؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: پڑھے لکھے لوگ بنیادی طور پر نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کلاس کے لوگ زندگی کی تلاش اور رزق کی مصروفیات میں مستقبل سے اتنے خوفزدہ ہیں کہ کوئی رسک ہی نہیں لے سکتے۔ اپنی زندگی گزارنے کے علاوہ کسی قسم کی ہمارے ملک میں قیادت کے رستے اس لئے مکمل بند ہیں کہ کوئی نچلے متوسط طبقے کا لڑکا سیاست کو بحیثیت پیشہ اختیار نہیں کر سکتا۔ صرف کوئی حادثہ اسے سیاست میں لے آئے، تو دوسری بات ہے۔ ہمارے یہاں جتنے بہترین عوام دوست بھی پیدا ہوئے ہیں، وہ زمینداروں کے طبقے سے ہیں اور وہ بھی ایسے طبقے سے، جہاں بھوک اور افلاس کا کبھی دورہ نہیں ہوا۔ جہاں آسائشات کثرت سے تھیں۔ ایک بات جو مجھے کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ جس شخص نے کبھی فاقہ نہیں کیا یا بھوکا نہیں رہا، وہ بھوکوں کے مسائل کیسے سمجھ سکے گا؟ ان لوگوں کو پتا ہی نہیں ہے کہ غربت کیا ہوتی ہے۔ غربت کے مسائل کیا ہوتے ہیں اور جو غریبوں میں سے اٹھتا ہے۔ جو اگر خوش قسمتی سے کبھی الیکشن میں آ جائے، وہ اپنے طبقے سے فرار حاصل کر رہا ہوتا ہے اور اس غربت کے ماحول میں پلٹنا نہیں چاہتا۔ دونوں طرف یہ بدقسمتی سیاست کو عوام تک نہیں آنے دیتی ہے۔

سوال: سر یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی نہایت مختصر ہے لیکن اس میں ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا اور ہوس کیوں پیدا ہوتی ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: بڑا خوبصورت سوال ہے جس کے لئے مجھے تھوڑا سا سوچنا پڑے گا۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ مذہب اس کا جواب دیتا ہے۔ مذہب اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ آدم کا جب ظہور ہوا اور جب انھوں نے عقل پائی، تو انھوں نے دیکھا کہ میں ابدی لوگوں کے بیچ میں ہوں۔ انھوں نے دیکھا کہ بڑی بڑی لمبی عمروں کے بیچ میں ہوں۔ خدا لازوال ہے۔ ملائکہ لازوال بڑی طویل عمروں کے لوگ ہیں۔ تو ایک بڑی قدرتی سی خواہش ان میں پیدا ہوئی کہ میری زندگی اتنی ہی ہو، جتنی ان لوگوں کو زندگی ہے تو ابدیت شعور کی وجہ سے ہے۔ شعور باقی رہنا چاہتا ہے زندہ رہنا چاہتا ہے۔ وہی بات جو میں نے پہلے کی کہ آپ کیسے جانتے ہیں؟ مجھے پتا نہیں ہے کہ جانوروں میں یہ شعور موجود ہے کہ نہیں۔ کیونکہ میں اس حد کے دماغ سے گزرا نہیں ہوں۔ مگر ایک بات کا مجھے پتا ہے کہ زندگی اگر شعور سے عاری ہو، تو وہ زندہ رہنا نہیں چاہتا۔ اسے کسی قسم کی زندگی کی خواہش نہیں ہوتی۔ زندگی بذاتِ

"ہمارا یہ جو پورا سلسلہ تناسل ہے اور یہ جو ہمارے نسلوں کے سلسلے ہیں، یہ بھی ہم سے تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم نام چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نام چھوڑنے کی خواہش بھی اگلی نسلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے۔ تو یہ زندہ رہنے کی خواہش ہیں اپنے ہم نشینوں سے حاصل ہوئی ہے جو بڑی طویل عمروں والے ہیں۔"

خود طوالت قدر ہیں۔ اسی کے اندر انتہائی شعور ہے باقی رہ جانے کا۔ ہمارا یہ جو پورا سلسلہ تناسل ہے اور یہ جو ہمارے نسلوں کے سلسلے ہیں، یہ بھی ہم سے تقاضہ کرتے ہیں کہ ہم نام چھوڑنا چاہتے ہیں۔ نام چھوڑنے کی خواہش بھی اگلی نسلوں میں اپنے آپ کو زندہ رکھنے کی خواہش ہے۔ تو یہ زندہ رہنے کی خواہش ہمیں اپنے ہم نشینوں سے حاصل ہوئی ہے جو بڑی طویل عمروں والے ہیں۔

سوال: سر بہت وقت گزر چکا ہے اور بڑی اچھی گفتگو ہوئی ہے۔ میں پہلے بھی آپ کا شکریہ ادا کر چکا ہوں۔ تو آخری سوال میں اجازت چاہوں گا آپ سے پوچھنے کے لئے کہ محبت اندھی کیوں ہوتی ہے اور کیا محبت کرنا محبت کرنے والے کے بس میں ہوتا ہے یا ایک مکمل بے بسی اور بے اختیاری اس کو اپنی گرفت میں لے لیتی

"یہ تصور غلط ہے۔ محبت اندھی بالکل نہیں ہوتی ہے۔ محبت بہت سیانی ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب کسی کو محبت کرنے والا دیکھتے ہیں، تو ہمارے خیال کے مطابق باقی لوگ جو اس پر رائے دے رہے ہوتے ہیں، وہ ضرور اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان کی قدر مشترک کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ محبت پروان چڑھی ہے۔"

ہے اور وہ اس رو میں بہتا چلا جاتا ہے؟

پروفیسر احمد رفیق اختر: یہ تصور غلط ہے۔ محبت اندھی بالکل نہیں ہوتی ہے۔ محبت بہت سیانی ہوتی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہم جب کسی کو محبت کرنے والا دیکھتے ہیں، تو ہمارے خیال کے مطابق باقی لوگ جو اس پر رائے دے رہے ہوتے ہیں، وہ ضرور اندھے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں پتا ہوتا کہ ان کی قدر مشترک کیا ہے، جس کی وجہ سے یہ محبت پروان چڑھی ہے۔ چلیں میں آپ کو ذرا سی بنوں کی مثال دے دوں۔ بنوں اختیار سے محبت کر رہا ہے اور زمانہ دیکھ چکا ہے۔ وہ آیا ہے۔ اس کو اچانک ایک خوبصورت خاتون نظر آ گئی ہے۔ وہ ایک امیر زادہ ہے۔ جس کے دل میں ایک چیز کو حاصل کرنے کا جنون ہے اور وہ اس جنون کو مکمل کرتا ہے۔ کسی کے حصول میں سادہ سی اس کی خواہش بن جاتی ہے جنون بن جاتا ہے۔

اب آپ سسی کی نظر سے دیکھیں۔ سسی بہت خوبصورت ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس پست سے ماحول میں ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی ہے اور پھر اچانک ایک شہزادہ آ نکلتا ہے۔ جب وہ اس کو تلاش کرتا ہے تو اگر آپ غور کریں، تو طبائع کے اختلاف سے تمام محبتیں جنون تک پہنچ گئی ہیں۔ یہی سوہنی مہینوال کا حال ہے۔ یہی قیس و لیلیٰ کا حال ہے۔ یعنی جب ایک شخص کی انتہائی شدید خواہش ایک پیٹرن آف لائف سے نکل کر دوسرے پیٹرن آف لائف تک جاتی ہے تو یہ محبت کو جنون بنا دیتی ہے۔ جو محبتیں ہمارے پاس مثال کے طور پر موجود ہیں ان کے ڈائیلاگ اتنے منتقل نہیں ہوئے۔ مگر ہر وہ چیز سے نظر آتا ہے کہ ایک پست درجے کی حسینہ یا نوجوان ایک بڑے طبقے کی محبت کو زیادہ پائیدار کر دیتا ہے۔ جیسے فرہاد شیریں کی محبت کو پائیدار کر دیتا ہے۔ پھر سوال یہ ہے کہ ان کو کوئی اور چوائس نصیب نہیں ہوئے۔ میں کل ہی بات کر رہا تھا کہ ہمارے یہاں محبت اس لئے زیادہ کامیاب ہے کہ اس میں ہمیں اختیارات یا چوائس نصیب نہیں ہوتے۔

ہم اپنے اندر سے گئے گزرے ہوتے ہیں۔ اپنے بحرانوں کے، کمتری کے شکار ہوتے ہیں کہ جو پہلا چانس ہمیں ملتا ہے اسے ہم اٹیچ کر لیتے ہیں۔ ہم اس کو بڑی شدت سے پکڑ لیتے ہیں۔

پھر انس کی کیفیت شاید محبت کی بنیاد ہے کہ جب آپ کسی سے انس محسوس کریں۔ وہ انس انسانیت کی بھی بنیاد ہے۔ جب انسان دوسرے انسان کے لئے زیادہ خلوص محسوس کرتا ہے یا کسی کی کمپنی میں شاد ہوتا ہے یا کسی کے قریب تر رہنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ تمام تر صفاتی ہے۔ اس میں فزیکل عنصر بہت کم آتا ہے اور جسمانی والی جو انس ہوتی ہے اس کو مودت کہتے ہیں اور جو صفاتی چیز ہے اس کو محبت کہتے ہیں۔ تو محبت کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو سوائے خدا کے جس میں اس قسم کے عناصر نہیں ہوتے ہیں۔ مگر بہت سے لوگ جو میرے پاس خدا کی محبت کا دعویٰ لے کر آتے ہیں، اس کے پس منظر میں یا تو مالی ضرورت نکل آتی ہے یا کسی عورت کی خواہش نکل آتی ہے۔ جب اس کو واچ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ آدمی خدا کو نہیں، بلکہ ان چیزوں کو چاہ رہا ہوتا ہے۔ تو محبت کے جائزے کے بعد بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اندھی ہے۔ اگر آپ دونوں شخصیات کا درست طور پر تجزیہ کریں۔ ان کے احساسات، ان کی نفسیات کو دیکھیں کہ کس چیز کو محبت تسکین دیتی ہے تو محبت اس چیز کا بہت بڑی ازالہ کرنے والی چیز ہے۔

====